نظریے، جدوجہد اور خاندان سے کٹی پارٹی

مستقبل

فرخ سہیل گوئندی

05-21-2013

پاکستان پیپلز پارٹی کی حالیہ انتخابات میں شکست کو 1997ء کے انتخابات میں شکست کے حوالے سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ وقت کا دھارا یا نئے سماجی حقائق، نئی سیاسی حقیقتوں کا سبب بنتے ہیں۔ 1977ء کے بعد جس پیپلز پارٹی نے جنم لیا، اس کی تاریخ پاکستان میں عوامی حقوق کی مثالی مزاحمتی تاریخ سے عبارت ہے۔ ایک جماعت کے مقبول ترین رہنما کو سولی پر چڑھا کر ''عبرت ناک مثال'' بنا دینے کے بعد پارٹی کے ہزاروں کارکنوں نے ناقابل یقین جدوجہد کا آغاز کیا۔ آمرانہ دورِ حکومت اور ایک رجعتی مردانہ معاشرے میں پارٹی کے کارکنوں نے ایک جواں سال لڑکی (بے نظیر بھٹو) کو اسلامی دنیا کی مقبول ترین خاتون رہنما کے طور پر متعارف کروایا۔ یہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن ہی تھے جن کی خون سے لبریز جدوجہد نے ایک آمر کے سامنے نہتی لڑکی کو لیڈر بھی منوایا پھر اسلامی دنیا کی پہلی وزیر اعظم بھی منتخب کروایا۔ 1967ء میں قائم کی گئی پی پی پی نے دراصل 1977ء کے بعد دوسرا جنم لیا اور یوں محترمہ بے نظیر بھٹو ایسی عوامی جدوجہد کے کارواں کی رہنما بنیں جس کی جھولی میں کوڑے، قیدیں، پھانسیاں اور ظلمت کدوں میں دل ہلا دینے والے ریاستی تشدد کی داستانیں تھیں۔ انہی سیاسی کارکنوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو آمریت اور تاریخ کے ہاتھوں مٹنے سے بچایا کہ جب کہا جا رہا تھا ''بھٹو کے بعد پارٹی نہیں رہے گی'' اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ ''بھلا ایک لڑکی بھی لیڈر ہوسکتی ہے اور وہ بھی ذوالفقار علی بھٹو کا بدل؟'' یہ پی پی پی کے جانثار کرنے والے ہزاروں کارکن تھے جنہوں نے دن رات ایک کر کے اپنی زندگیاں اس جدوجہد کے نام کر کے، افسانوی کہانی کو حقیقت میں بدل دیا۔

یاد رہے، جتنا بڑا کارنامہ جنرل ضیاالحق کی آمریت کے خلاف جدوجہد کرنا تھا، اس سے بڑا کارنامہ ایک رجعتی اور مردانہ معاشرے میں ایک عورت کی سیاسی قیادت کے وجود کو تسلیم کروانا بھی تھا۔ پاکستان ان دنوں ایک ایسا ملک تھا جو امریکا کا دنیا میں سب سے بڑا لاڈلا تھا، افغانستان میں نام نہاد جہاد کی امریکی پالیسی کے سبب ایسے دَور میں جمہوریت، آئین کی بحالی اور سیاسی آزادیوں کے لیے جدوجہد کی امریکہ اور اس کے ''جمہوری ادارے'' حمایت نہیں کرتے تھے۔ سرمایہ دار مغرب کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک پاکستان میں آئین کی بحالی، جمہوریت کا قیام، انسانی حقوق کی دھجیاں اڑانے کا عمل، سیاسی کارکنوں کی پیٹھوں پر کوڑے، ہزاروں کی تعداد میں جیلوں میں مقید سیاسی کارکن اہم نہیں تھے۔ اُن کے (جہادی) ہیروز کی بنیاد پر ہالی وڈ Rambo کے نام پر فلمیں بنا رہا تھا کہ ان کے ''اتحادی مجاہدین'' کس طرح کافر اشتراکیوں کے خلاف صف آراء ہیں۔ ایسی فضا میں پاکستان کے عقوبت خانوں میں تشدد کے سبب اٹھنے والی چیخوں کی کیا حیثیت ہوسکتی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے کارکن ایک نئی تاریخ رقم کر رہے تھے، ایک پارٹی کا اور قیادت کا جنم ہو رہا تھا۔ راقم اس کارواں میں ایک ادنیٰ حیثیت میں شامل تھا۔ یہ کارواں رومانس کی انتہائی جذبوں سے سرشار تھا، مجھے آج بھی ایسے درجنوں نہیں سینکڑوں چہرے یاد ہیں جو دن رات چھپ چھپ کر اکٹھے ہوتے اور از خود منظم ہو کر بکھری جدوجہد کو اکٹھا کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ جدوجہد کرنے والے لوگ تین حصوں میں تھے، جیلوں میں بند، خفیہ رابطوں میں جڑے رُوپوش، جو ہر وقت پارٹی کے دوسرے جنم کے لیے کوشاں تھے اور آہستہ آہستہ جلاوطن ہونے والے۔ لیکن جدوجہد کے تینوں حصوں میں ایک ناقابل بیان ربط، تنظیم اور اتحاد تھا۔ کبھی کبھی جیل سے کچھ رِہا ہوجاتے تو دوبارہ جدوجہد میں شامل

ہو جاتے۔ اکثر کے بارے کہا جاتا کہ دوبارہ جیل جانے کے لیے ہی تو باہر آئے ہیں۔ پاکستان میں جاری اس جمہوری اور عوامی جدوجہد کی دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ (سرمایہ دارانہ) ملک نے حمایت نہ کی، یہ جدوجہد عالمی میڈیا میں برائے نام ہی ظاہر کی گئی، اس لیے کہ اُن کے اتحادی جنرل ضیا کے مخالف، اُن کے بھی مخالف تھے۔

ان سیاسی کارکنوں کے خلاف اس وقت محاذ قائم ہوا جب ان کی پارٹی پر 1977ء کے انتخابات میں دھاندلی کے الزامات کا آغاز ہوا اور پھر اس دھاندلی کے خلاف تحریک منظم کی گئی۔ سیالکوٹ میں اس تحریک کے مظاہرین نے جب پی پی پی سے تعلق رکھنے والے گھر کو نذرِ آتش کیا تو مظاہرین کی گھر کی آگ لگانے سے تسلی نہ ہوئی، پھر اس گھر کے اہل خانہ کو سڑک پر لا کر مارا گیا اور سر بازار دانت توڑے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جہاں سے پاکستان میں تشدد کی سیاست کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کے بعد ان مظاہرین کی حمایت یافتہ فوجی آمریت مسلط کی گئی، پھر فوجی آمریت نے وہ کچھ کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ لیکن پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن شکست سے آشنا ہی نہ تھے، انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی کو پہلے سے بھی بڑی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو تو نظر بند، قید اور جلاوطن کر دی گئی تھیں، یہ پارٹی کے کارکن ہی تھے جنہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی مشعل روشن رکھی، کھرا جذبہ اور انسان دوست سیاست کا پرچم، عوامی حقوق کی بازیابی، درمیانے اور محنت کش طبقات کی قیادت اس کارواں کو میسر ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی 1977ء کے بعد ایک جدوجہد کے ایک ایسے فلٹر سے گزری جس نے پارٹی کو اس میں گھسے جاگیرداروں کے بڑے ٹولے سے پاک کر دیا۔ ریاست، حکومت اور تمام میڈیا، جی ہاں تمام میڈیا، اس پارٹی اور کارکنوں کے خلاف بڑا محاذ بنانے، اسے کچلنے کی کوششیں کرتا رہا، لیکن پارٹی ختم نہ کی جا سکی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جو تاریخ ساز جدوجہد کی، افسوس ہمارا ادیب، مؤرخ اور شاعر بھی اس پر خاموش ہے۔ ادیب محبت کے کرداروں پر قلم آزمائی کرتے رہے، مؤرخ مغلیہ تاریخ اور شاعر گل و بلبل کی داستانوں سے اپنے اشعار سجاتے رہے۔ بقول ژاں پال سارتر، ایسے ادیب، شاعر اور مؤرخ وقت اور تاریخ سے کٹے ہوئے ہیں، جو اپنے اردگرد برپا عوامی جدوجہد سے اپنے آپ کو منقطع رکھتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے پاکستان میں فوجی آمریت کے خلاف 1977ء سے 1988ء تک جو جدوجہد کی، اس کا تمام تر سہرا صرف اور صرف اس کے کارکنوں کے سر ہے۔ کاش یہ صفحات اجازت دیں تو ستر ہزار سے زائد اُن کارکنوں کے نام یہاں رقم کر دوں۔ آج پاکستان میں تبدیلی اور جمہوریت کا پرچم بلند کرنے والے اپنی تاریخ کے اس باب کو ٹٹو لیں تو انہیں پتا چلے کہ رزاق جھرنا، پھانسی کی رات کس طرح اپنے جسم پر جکڑی بیڑیاں چھنکاتے ہوئے یہ گیت گاتا رہا۔ جھانجراَج کج کہندی اے!

پھانسی پر چڑھنے والے ایک دوسرے نوجوان عثمان غنی نے آخری وصیت کی کہ ’’جب میری قائد بے نظیر بھٹو میرے گھر میرے قتل کا افسوس کرنے آئے تو سگریٹ کی ڈبی کی پنّی سے بنا یہ تاج اس کے سر پر سجایا جائے کیوں کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی اور تحفہ ہے ہی نہیں۔‘‘ راقم نے یہ تاج اپریل 1986ء کو بے نظیر بھٹو کے سر پر باندھا اور عرض کیا کہ محترمہ! آپ پارٹی کو اس کے فلسفے کے مطابق منظم کریں تا کہ پارٹی پاکستان میں اپنے وعدے اور کی گئی جدوجہد کے مطابق 98 فیصد عوام کی جماعت بن کر طبقاتی تقسیم کو مٹا دے۔ محترمہ کی اشکبار آنکھیں کبھی نہیں بھلائی جا سکتیں، لیکن افسوس محترمہ نے 1986ء کے بعد آگ اور خون کا دریا عبور کرنے والے کارکنوں کے کارواں کی قیادت کرتے ہوئے اپنی جماعت کے دروازے یوسف رضا گیلانی جیسے لوگوں کے لیے کھول دیئے۔ وہ پارٹی جس میں جاگیردار خاندانوں کی بجائے متوسط اور درمیانے طبقے کے خاندانوں نے ناقابل بیان جدوجہد کرتے ہوئے نئی تاریخ رقم کی، جیسے آغا برادران، جی ہاں سمن آباد کا ایک خاندان، والد آغا عصمت اللہ، والدہ، بہن اور تمام بھائی، آغا ندیم، آغا وسیم، آغا نوید، آغا علیم، آغا ولید اور آغا تنویر۔

لیکن جب محترمہ اپریل 1986ء میں پاکستان آئیں تو وہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ وہ ’’ایک مختلف‘‘ سیاست کا آغاز کریں گی۔ پاکستان پیپلز پارٹی جو صرف اور صرف اپنے کارکنوں کی بنیاد پر دوسری بار ابھر کر سامنے آئی، اس کی تنظیم سازی میں اب کارکن کی بجائے خاندان، سرمایہ دار، ذات، برادری، قبیلہ اور طاقت ور ہونا اہم ٹھہرا اور پھر وقت نے دیکھا پہلے پارٹی سے نظریہ غائب ہونے لگا، آہستہ آہستہ نظریاتی کارکن، بعد میں خاندان (بھٹو خاندان) بکھرا اور خاندان کا اہم فرد مرتضیٰ بھٹو کا قتل ہوا اور پھر محترمہ بے نظیر کا قتل۔ نظریہ، جدوجہد اور خاندان 2008ء تک پارٹی سے مٹا دیئے گئے اور پارٹی پر سرمائے، قبیلوں، خاندانوں، برادریوں کا راج ہوا اور پھر حالیہ انتخابات میں جب نتائج سامنے آئے تو ووٹ بھی